فلسفۂ یونان کا پھیلاؤ اور مسلم فلسفے کی نمو پذیری

پروفیسر نعیم احمد

تازہ پھر دانشِ حاضر نے کیا سحرِ قدیم
کز رہِ اس عہد سے ممکن نہیں بے چوبِ کلیم

مشہور مستشرق اولیری کے خیال میں تہذیب وثقافت کے پھیلاؤ اور کسی متعدی بیماری کے پھیلنے کے درمیان ایک قسم کی مناسبت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دونوں مس یا رابطے سے پھیلتی ہیں اور دونوں کے بارے میں انسانی ذہن یہ سوال اٹھاتا ہے کہ یہ کہاں سے شروع ہوئیں اور کیسے پھیلیں؟ جس طرح متعدی امراض کے منبع و مصدر کا سراغ لگایا جاتا ہے۔ ویسے ہی تہذیبوں کی اثر آفرینی اور اثر پذیری کے بارے میں بھی مفکرین تحقیق کرتے ہیں۔

زمانۂ قدیم میں مختلف تہذیبوں کے مابین تعامل اور رابطے کے دو بڑے ذریعے تھے۔ ایک تجارت اور دوسرے جنگ۔ بابل کی تہذیب میلیٹس (Melitus) کی بندرگاہ سے ہوتی ہوئی یونان پہنچی۔ فلکیات اور علم ہندسہ کے بعض تصورات کے علاوہ بہت سے عقائد میلیٹس اور لڈیا (Lydia) کی باہمی تجارت کے ذریعے یونان پہنچے۔ فیثا غورث کے بارے میں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ وہ سفر کرتے ہوئے ہندوستان کی سرحدوں تک پہنچا تھا اور وہاں سے اس نے (ہندوستان) ہندو رشیوں سے تناسخ ارواح کا عقیدہ مستعار لیا تھا۔ قدیم مصری تہذیب میں روح کی بقائے دوام کا عقیدہ مسلّم تھا، چنانچہ یونان کے بعض فلاسفہ کے ہاں یہ عقیدہ نظریہ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کے متصوفانہ عقائد پر مصری سریت کی گہری چھاپ محسوس ہوتی ہے۔

تجارتی تعلقات کے علاوہ کسی تہذیب کی اشاعت و ترویج کا دوسرا اور مؤثر ترین ذریعہ جنگ و جدال اور کشور کشائی ہے۔ جب کسی دریا میں طغیانی آتی ہے تو وہ اپنے کناروں سے باہر نکل کر دور دور تک کے علاقے میں تباہی مچا دیتا ہے لیکن جب اس کی طغیانی ختم ہو جاتی ہے تو اس کا پانی دوبارہ اس کے کناروں کے اندر سمٹ جاتا ہے تو جہاں تباہی و بربادی کے ہولناک مناظر سامنے آتے ہیں، وہیں نشوونما کے لامحدود امکانات بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ متاثرہ علاقوں کی مٹی پہلے سے زیادہ زرخیز ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جب کسی تہذیب کی عسکری قوت اپنی جغرافیائی سرحدوں سے باہر امڈ پڑتی ہے تو اردگرد کے علاقوں میں تباہی و بربادی اور کشت و خون کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کشور کشائی اور ملک گیری کی ہوس نہایت انسانیت سوز اور لرزہ خیز واقعات و حوادث کو جنم دیتی

ہے۔ لیکن اس امر سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ فاتح عساکر کے جلو میں چلنے والے غیر مرئی تہذیبی اور ثقافتی عوامل اپنے نشو و ارتقاء کے لئے نئی سرزمین ڈھونڈ لیتے ہیں۔ یہ بھی ہُوا ہے کہ وحشی اور غیر متمدن فاتحین نے مہذب علاقوں کو فتح کیا تو بتدریج اُسی مفتوحہ تہذیب میں گم ہو گئے۔ نیلے جادو دانی آسمان کے پجاری اور پختہ مکانوں کی رہائش سے نفرت کرنے والے منگول مہذب علاقوں کو روندتے ہُوئے ہر طرف چھا گئے لیکن مفتوحہ علاقوں کی ثقافت کی چھوت سے نہ بچ سکے، بالآخر اسی میں مدغم ہو گئے۔

تاریخِ عالم میں ایک ہزار قبل مسیح سے ولادتِ مسیح تک کا زمانہ لوہے کا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ اس زمانے میں لوہے کی دریافت ہُوئی۔ فلسطین میں یہودیوں کی سلطنت قائم ہُوئی، اشوریوں، بابلیوں اور ایرانیوں نے عروج و زوال کے مناظر دیکھے۔ ہندوستان میں بدھ مت اور جین مت، چین میں کنفوشس اور یہودیوں کے نبیوں اور یونان کے فلسفیوں کا ظہور اسی دور میں ہُوا۔ اس دور کے آخر میں سکندرِ اعظم نے مغربی ایشیا پر یلغار کی، روم کی سلطنت کو عروج حاصل ہُوا اور عالمگیر علمی اور روحانی تحریکوں نے فروغ پایا۔

اس لوہے کے دور کے ابتدائی چند سو سال میں یونان طوائف الملوکی کا شکار رہا۔ یونان میں متعدد چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم تھیں جن کے درمیان پہاڑیاں اور خلیجیں حائل تھیں جو ان ریاستوں کو طبعی طور پر الگ تھلگ رکھتی تھیں۔ مختلف شہری ریاستوں میں مختلف قسم کے سیاسی معاشی اور عمرانی تجربے کئے جا رہے تھے اور یونان میں مجموعی طور پر نیم شاہی اور نیم پنچایتی سماج تشکیل پا چکا تھا۔ یونانیوں کے محبوب مشاغل زراعت، باغبانی، زیتون اور انگور کی کاشت، تیل اور شراب کی تجارت، بحری ڈکیتیاں اور ماہی گیری وغیرہ تھے۔ ایشیائے کوچک کے ساحل پر بھی کئی یونانی ریاستیں قائم ہو چکی تھیں جو فریجیہ اور لیڈیا کی بڑی ریاستوں کے زیر اثر تھیں۔ ان ریاستوں کے ایشیا اور یورپ کے ساتھ تجارتی روابط تھے۔ یونان کی ریاست اسپارٹا نسبتاً مضبوط اور مستحکم تھی۔ اسپارٹا والوں نے زبردست فوجی قوت پیدا کر لی تھی۔ ۵۱۲ ق م میں ایرانی شہنشاہ داریوش اور ۴۸۰ ق م میں اس کے جانشین اخشویرس نے یونان پر چڑھائی کی لیکن یہ دونوں حملے ناکام بنا دیے گئے۔ یونان کے دفاع میں اسپارٹا والوں نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ ایرانی خطرے کے پیشِ نظر تمام یونانی ریاستوں نے اتحاد کی سرکردگی میں منظم ہو کر ایک دفاعی سلطنت قائم کر لی۔ اس دفاع میں اسپارٹا والے شریک نہ ہُوئے بلکہ ایتھنز اور اسپارٹا میں چھڑپیں ہوتی رہیں۔ ۴۸۶ ق م میں ایرانیوں نے اسپارٹا والوں سے ایک معاہدہ کر لیا جس کی رو سے انہوں نے ایشیائے کوچک کی ساحلی ریاستوں کو اپنے زیر نگیں کر لیا اور دیگر یونانی ریاستوں کی آزادی تسلیم کر لی۔ ۴۷۱ ق م میں اسپارٹا والوں نے ایک یونانی ریاست ہیوٹیا سے شکست فاش کھائی اور ان کی عسکری قوت کا طلسم بکھر گیا۔ اسپارٹا کے زوال کے بعد یونانیوں کی سرزمین ایک بار پھر انتشار اور سیاسی عدم استحکام کا شکار ہو گئی۔

اس طوائف الملوکی اور افراتفری سے ریاست مقدونیہ کے بادشاہ فیلقوس نے فائدہ اٹھایا اور دیگر یونانی ریاستوں کو بزورِ شمشیر یا بزورِ تدبیر اپنے تابع فرمان کر لیا۔ اس نے یونانی ریاستوں کو از سرِ نو متحد و منظم کر کے ایرانیوں پر فیصلہ کن ضرب لگانے کی تیاریاں شروع کر دیں لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ۳۶۰ ق م میں فیلقوس کی ملکہ اولمپیس نے سازش

کر کے فیلقوس کو قتل کروا دیا اور اپنے بیٹے سکندر کو تخت پر بٹھا دیا۔ جب سکندر بادشاہ بنا تو اس کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی۔ سکندر کو علم تھا کہ اس کا باپ ایران پر ضرب کاری لگانے کا ارادہ رکھتا تھا؛ چنانچہ باپ کے مشن کی تکمیل کے سلسلے میں اس نے سب سے پہلے ایشیائے کوچک کی ان ساحلی ریاستوں پر چڑھائی کی جو ایرانی فوجوں کے زیر تسلط تھیں۔ یہاں ایرانی فوجوں کا قلع قمع کرنے کے بعد سکندر کی فوجیں شام تک پہنچیں اور فتح و نصرت کے پرچم لہراتی ہوئی روم کے ساحل کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف بڑھنے لگیں۔ یہاں ایرانیوں کا جو بھی ساحلی قلعہ اور بحری مرکز ان کے سامنے آیا انہوں نے اسے تاخت و تاراج کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے انطاکیہ کا محاصرہ کر لیا اور دو سال کی سخت جدّ و جہد کے بعد اسے فتح کر لیا۔

انطاکیہ کی مہم کے بعد سکندر اعظم کا ارادہ ایرانی سلطنت پر چڑھائی کرنے کا تھا۔ لیکن اس مقصد کے لئے ضروری تھا کہ مصر کو پہلے فتح کر لیا جائے تاکہ عقب سے حملے کا خطرہ نہ رہے؛ چنانچہ ۳۳۲ ق م میں اس نے مصر پر حملہ کیا اور اسے فتح کرنے کے بعد یہاں انتظام و انصرام کیلئے ایک جرنیل چھوڑ کر وہ شام کی طرف لوٹ گیا۔ وہاں اس نے اپنے لشکر کی از سر نو تنظیم کی اور ایران کے دارالحکومت قصر سوسن کی جانب پیش قدمی شروع کر دی۔ ایران کے شہنشاہ دارا سوم کے عساکر بابل کی سرزمین میں گاؤگیلا (اربیلا) کے مقام پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے؛ چنانچہ یونانیوں کے بڑھتے ہوئے لشکر کا اس مقام پر ایرانی فوجوں کے ساتھ نہایت خونریز تصادم ہوا۔ ایرانی میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ دارا خراسان کی جانب فرار ہو گیا جہاں وہ اپنے فوجیوں کے ہاتھوں ہلاک ہوا۔ قصر سوسن میں دنیا بھر کا مال و متاع جمع کیا ہوا تھا۔ اسکندر نے اسے لوٹ کر نذر آتش کر دیا۔

اس زمانے میں ایران کی سلطنت دریائے اٹک تک پھیلی ہوئی تھی۔ اسکندر افغانستان سے ہوتا ہوا درّۂ خیبر کے راستے پنجاب میں آ گیا۔ دریائے جہلم کے کنارے راجہ پورس سے اس کا تصادم ہوا اور اسے شکست دینے کے بعد وہ پنجاب کی سرزمین کو روندتا ہوا دریائے بیاس کے کنارے آ پہنچا۔ یہاں اس کی فوجوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا؛ چنانچہ اسکندر کی پورے ہندوستان کو فتح کرنے کی آرزو پوری نہ ہو سکی۔ یہاں اس نے لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصہ کشتیوں پر دریائے بیاس اور دریائے ستلج کے راستے کراچی پہنچا اور وہاں بحیرۂ عرب کے ساحل کے ساتھ ساتھ سوسہ کی طرف واپس چلا گیا جبکہ دوسرا حصہ درہ خیبر کے راستے سے ہوتا ہوا افغانستان اور ترکستان چلا گیا جہاں سکندر نے اپنے ایک جرنیل سلیوکس (Seleucus) کو حاکم مقرر کیا ہوا تھا۔ ۳۲۴ ق م میں سکندر سوسہ پہنچا جو ایران کا پایۂ تخت تھا۔ یہاں بیٹھ کر وہ اپنے مفتوحہ علاقوں پر حکمرانی کرنے لگا۔ ۳۲۳ ق م میں سکندر بابل گیا ہوا تھا کہ وہیں وفات پا گیا۔

اسکندر کے بعد کوئی ایسا فوجی جرنیل نہ تھا جو اس کی طرح بہادر، دور اندیش اور فوجی مدبر ہوتا اور سب کو یکساں طور پر قابل قبول ہوتا؛ چنانچہ اس کی فتح کی ہوئی وسیع سلطنت تین حصوں میں منقسم ہو گئی۔ ایک یونانی سلطنت کی تین یونانی سلطنتیں بن گئیں۔

ایران کی بادشاہت یونانی جرنیل سلیوکس نے سنبھال لی اور دریائے سندھ سے لے کر بحیرہ روم تک کی سرزمین پر

اس کا تسلط قائم ہو گیا۔ مصر میں یونانی جرنیل بطلیموس (Ptolemy) نے اپنے مطلق العنان حکمران ہونے کا اعلان کر دیا۔ سرزمین یونان میں خانہ جنگی کے بعد ایک یونانی جرنیل نے اپنے پاؤں مضبوط کر لیے۔ یہ تینوں ریاستیں شام، فلسطین اور ایشیائے کوچک کی بندرگاہوں پر اپنا اپنا تسلط قائم کر کے سیاسی اور فوجی فوائد حاصل کرنا چاہتی تھیں چنانچہ ان میں مسلسل جنگیں ہوتی رہیں۔ ایک سو ق۔م کے لگ بھگ ایک نئی طاقت ابھری یہ وسطی ایشیا کے بدوی قبائل تھے جو پارتھی (Partnians) کہلاتے تھے۔ انہوں نے سلیوکس کی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور ایران میں پارتھیوں کی خود مختار ریاست قائم کر لی۔ اسی طرح خانہ جنگیوں اور باہمی عداوتوں کے سلسلے میں ایشیائے کوچک، شام اور فلسطین میں بھی کئی چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں قائم ہو گئیں جن کی حیثیت چھوٹی موٹی جاگیروں کی سی تھی۔ اس دوران اٹلی کے رومی بھی اپنی ایک مخصوص تہذیب اور زبردست عسکری قوت کے ساتھ ابھر چکے تھے۔ رومیوں نے ایک سو ق۔م کے قریب حملہ کر کے ایشیائے کوچک، شام اور فلسطین کی تمام ریاستوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ یونان کے یونانیوں کی حکومت کا خاتمہ بھی رومیوں نے ۱۴۶ ق۔م میں کر دیا۔ اسی طرح مصر کے بطلیموسی حکمران بھی ۳۰ ق۔م میں رومیوں سے شکست کھا کر گمنامی کے اندھیروں میں غائب ہو گئے۔

ان حالات میں مغربی ایشیا پر یونانی تہذیب و تمدن میں نہایت گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ بڑے بڑے شہروں میں حکمرانوں نے یونانی سپاہ رکھی ہوئی تھی۔ تمام کاروبار یونانی زبان میں ہوتے اور جو کوئی اعلیٰ منصب تک رسائی کا خواہاں ہوتا اسے سب سے پہلے یونانی زبان پڑھنا پڑتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مقامی آبادیوں کے انداز و اطوار زیادہ تبدیل نہیں ہوئے تھے تاہم یونانی اثرات بہت دور رس اور ہمہ گیر تھے۔ دراصل یونانیوں نے اشراف یا امراء کا ایک طبقہ تیار کیا تھا جو نچلے درجے کے عوام سے گھل مل کر نہیں رہتا تھا۔ اس طرح مقامی آبادیاں مکمل طور پر ہیلانیائی (Hellenistic) رنگ میں بہت رنگی ہوئی تھیں۔ رومیوں نے جب یونانیوں کے اقتدار کا چراغ گل کیا تو انہوں نے اپنے اثرات چھوڑنے کی بجائے یونانی اثرات کو ہی گہرا کیا[۲۳]۔ اس کے بعد جب عیسائیت کو فروغ حاصل ہوا تو رومی حکومت اور کلیسا نے مل کر کام شروع کر دیا۔ چنانچہ مسیحی مبلغوں نے یونانی تہذیب و ثقافت کی اشاعت میں ایک خاص کردار ادا کیا۔ اسی سے بحث ہم کچھ دیر بعد نسطوری عیسائیوں کے ضمن میں کریں گے۔

سکندر اعظم نے مصر فتح کرنے کے بعد ایک ایسی بندرگاہ کی تعمیر کرنے کا ارادہ کیا جو سارے علاقے کی تجارت کو کنٹرول کر سکتی اور دفاعی لحاظ سے بھی موثر ترین ثابت ہوتی۔ چنانچہ اس نے ۳۳۲ ق۔م میں شہر اسکندریہ کی بنیاد رکھی۔ پلوٹارک (Plutarch) کا کہنا ہے کہ اس شہر کا نقشہ سکندر اعظم کو ہومر نے خواب میں دکھایا تھا۔ شہر کی منصوبہ بندی اور تعمیر کی ذمہ داری رہوڈس (Rhodes) کے ڈائنوکریٹس (Dinocrates) کو سونپی گئی۔ کہتے ہیں کہ اسکندریہ زمانہ جدید کے شہروں کا پیش رو ہے۔ مسلمان فاتحین نے جب اس شہر کا محاصرہ کیا[۲۴] تو بقول پروفیسر ہٹی ان کی کیفیت وہی ہوئی ہوگی جو آج کے دور میں کسی پسماندہ علاقے کے شخص کی پہلی دفعہ نیویارک پہنچنے پر ہوتی ہے۔ اس دور کے مورخین کے مطابق وہ شاہراہ جو شہر کے وسط میں شرقاً غرباً پھیلی ہوئی تھی، سو فٹ

چوڑی تھی اگرچہ آثار قدیمہ کے ماہرین کو ابھی تک کسی ایسی سڑک کے آثار نہیں ملے، تاہم یہ سڑک اتنی چوڑی ضرور رہی ہوگی جس پر سے تھیوکرائٹس (Theocritus) کے بیان کردہ بڑے بڑے جلوس گزرا کرتے تھے۔

سکندر کی وفات کے بعد جب مصر پر اس کے جرنیل بطلیموس (Ptolemy) کی حکومت قائم ہوئی تو اس نے اس شہر کو اپنا دارالحکومت بنالیا۔ بطلیموس اور اس کی سپاہ کو مصری تہذیب نے جلد ہی اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ مصریوں نے پٹولیوں (بطلیموسیوں) کو فراعنہ مصر کا ہی ایک نیا خاندان قرار دیا۔ اس طرح مصری اپنے پرانے مسلک پر بھی قائم رہے اور اس کے ساتھ ساتھ نئی تہذیب کو بھی اپنا لیا۔ بطلیموس اوّل نے اس شہر کو بہت ترقی دی۔ دس مربع میل میں پھیلا ہوا بلند و بالا عمارات اور کشادہ سڑکوں والا یہ شہر اس دور کی ہیلانیاتی دنیا میں عدیم المثال تھا۔ تجارتی مرکز ہونے کی وجہ سے یہاں خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ بطلیموس حکومت میں یہ شہر تین قوموں کا سنگم بن گیا تھا۔ اس میں اسرائیل نسل کے وہ لوگ آباد تھے جو دیگر اسرائیلیوں کی طرح حضرت موسیٰؑ کے ساتھ واپس نہیں گئے تھے۔ پھر ان یہودیوں کی بھاری اکثریت یہاں آکر بس گئی تھی جنہیں بخت نصر نے بابل سے مار بھگایا تھا۔ تیسرے وہ یونانی لوگ تھے جو سکندر اعظم کے ساتھ آئے تو یہیں بس گئے۔ چوتھے اصل مصری تھے جنہیں قبطی کہا جاتا تھا۔

بطلیموس اوّل نے اپنی وفات سے کچھ سال پہلے اسکندریہ میں ایک عجائب گھر تعمیر کروایا جس میں نادر اشیاء جمع کی جاتی تھیں۔ یہ نادر اشیاء میوزز (Muses) کے نام منسوب تھیں۔ بطلیموس حکمران نہایت علم دوست تھے۔ چنانچہ انہوں نے عجائب گھر کے ساتھ ایک بڑی لائبریری بھی بنوائی جس میں پرانے نسخوں اور دستاویزات کی نقول تیار جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ کتابوں کو مختلف زبانوں میں ترجمہ بھی کیا جاتا تھا۔ عجائب گھر اور لائبریری کے ساتھ ایک درسگاہ بھی بنوا دی گئی جس میں ماہر اساتذہ طلبہ کو درس دیا کرتے تھے۔ عہد نامہ عتیق کا یونانی میں ترجمہ اسی دور میں ہوا۔ معاشی طور پر خوشحال بندرگاہ ہونے اور علم و ادب کا مرکز ہونے کی وجہ سے اسکندریہ میں دُور دُور سے اہل علم آکر بس گئے۔ اقلیدس بھی یہیں پروان چڑھا جس نے علم ہندسہ پر کئی رسالے تحریر کئے۔ ایک ارسطو تھینیس تھا جس نے زمین کے محیط کی پیمائش کا اندازہ لگایا یہ اندازہ موجودہ پیمائش سے صرف پچاس میل کم ہے۔ اپولونیئس نے مخروطی اشیاء کی مساحت کے اصول وضع کیے۔ رشمس ہیئت دان تھا جس نے ستاروں کے نقشے تیار کیے۔

ارشمیدس نے علم طبعی میں بہت سی تحقیقات کیں۔ ہیروفلس علم الابدان کا ماہر تھا جس نے مردوں کو چیر پھاڑ کر اعضاء کا معاینہ کرنے کا کام شروع کیا تھا۔ مختلف قوموں کے اس اختلاط کے باعث مذہبی خیالات اور عقائد میں بھی بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ بعض مصری دیوتاؤں کی عبادات ترک کر دی گئیں اور ان کی جگہ نئے دیوتا تخلیق کر لیے گئے۔ مثلاً نوافلاطونیت کا اصل بانی امونیس ساکاس اور خود فلاطینوس نے اسکندریہ ہی میں تعلیم حاصل کی۔ نوافلاطونیت کی تعلیمات کو بعد ازاں فرفریوس اور اس کے شاگرد لیمبلیکس (Lamblicus) نے تحریری صورت میں قلمبند کر لیا۔ اور زبانی تبلیغ بھی کرتے رہے۔ مسلمانوں کو نوافلاطونیت کا علم انہی کے توسط سے حاصل ہوا تھا

ولادت مسیح کے چند سو سال بعد یونانی تہذیب و ثقافت کی ترویج و اشاعت میں کلیسا نے بھی خاصا اہم کردار ادا کیا۔

اوریجنیوس اور کلیمنٹ دو ممتاز عیسائی مفکر تھے، جنہوں نے بیلاطینیاتی فلسفے کو عیسائی الٰہیات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ اوریجنیوس جلد ہی اسکندریہ کی سیاسی کھینچا تانی سے تنگ آکر فلسطین چلا گیا۔ وہاں اس نے اسکندریہ کی طرز کا ایک مدرسہ قیصریہ کے مقام پر قائم کیا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد ۲۷۰ء میں مالشیس نے انطاکیہ کے مقام پر اسی طرز کا ایک سکول قائم کیا۔ اس کے پچاس سال بعد نصیبین کے ایک سریانی بولنے والے فرقے نے بھی اسی طرز کا ایک سکول قائم کیا۔ ان مدارس میں عیسائیت کی تعلیم کے ساتھ ساتھ یونانی فلسفے کے مسائل پر بھی بحث کی جاتی تھی۔ انطاکیہ مکتبۂ فکر کے عیسائی اس امر پر پختہ یقین رکھتے تھے کہ حضرت مسیح شروع سے آخر تک بشر تھے۔ البتہ منصبۂ وجود پر تشریف لانے کے بعد ان کو عارضی طور پر وصلِ الٰہی ہوا۔ ان عیسائیوں کا رہنما نسطوریس اسقفِ قسطنطنیہ تھا۔ اس کے برعکس راسخ العقیدہ عیسائی حضرت مسیح کو خدا کا ظہورِ اوّل سمجھتے تھے اور یہ یقین رکھتے تھے کہ مسیح کا ظہورِ ثانی بھی ہوگا۔

نسطوری عیسائی مسیح کے ظہورِ ثانی کے منکر تھے۔ اپنے عقائد و نظریات کے اثبات میں یونانی فلسفے کی مدد لیا کرتے تھے۔ اس طرح وہ تبلیغ کے ساتھ ساتھ یونانی فلسفے کی ترویج و اشاعت بھی کرتے گئے۔ اسلام کی آمد سے پہلے مشرقی دنیا میں یونانی فلسفے پر انہیں سند مانا جاتا تھا۔

اسکندریہ کے مدرسے میں قدیم یونانی علوم کی روایت اگرچہ برقرار رہی تاہم ان علوم کی تشریح و تعبیر مختلف انداز میں کی جانے لگی۔ مفکرین اپنے منفرد انداز میں طبیعات، کیمیا، فلکیات، فلسفے اور منطق پر تحقیق کرتے۔ اس طرح اسکندریہ کے مدرسے کی ایک اپنی تحقیقی اور تنقیدی فضا بن گئی تھی۔ اسکندریہ کے علاوہ دیگر علاقوں میں بھی (جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے) کئی مدرسے قائم ہو چکے تھے جن میں کم و بیش فلسفۂ یونان ہی کی روح رواں دواں تھی۔ ان مدرسوں میں جہاں کئی قابلِ ذکر مفکر پیدا ہوئے وہیں تصنیف و تالیف کا کام بھی بہت زیادہ کیا گیا۔ ان مدارس اور ان کے جمع کردہ علمی سرمائے سے مسلم فلسفے کی نمو پذیری کے لئے زمین تیار ہوئی۔

مسلمانوں کے فکری عروج کا زمانہ اگرچہ جدتِ طبع اور ندرتِ فکر سے مزین ہے تاہم اس کی بنیادی خصوصیت "ترجمے" کی ہے۔ سنسکرت اور یونانی نسخوں اور دستاویزات کے عربی زبان میں تراجم کرائے گئے۔ ۷۶۲ء میں پہلے عباسی خلیفہ المنصور نے اپنے دارالخلافہ عروس البلاد بغداد کی بنیاد رکھی۔ اس نے دور دراز کے علاقوں سے علماء اور حکماء کو اس شہر میں بلایا اور علوم و فنون کی کتب کے ترجموں کا سلسلہ شروع کروایا۔ ان تراجم میں ابو یحییٰ (۸۰۹ء - ۸۷۳ء کے درمیان) کا نام سرِفہرست ہے۔ ابو یحییٰ نے بقراط اور جالینوس کی بیشتر تصانیف، بطلیموس کی "کواڈری پارٹیم" اور "المجسطی" اور اقلیدس کی "مبادیات" کے ترجمے کیے۔ اس کے علاوہ نسطوری طبیب جارج بختیشوع، اس کے دو بیٹے بختیشوع دوم اور جبرئیل، بختیشوع کے شاگرد عیسیٰ ابن تھاکربخت، جان یاد ماسر، قسطا بن لوقا اور حجاج بن یوسف کے نام مشہور ہیں۔

تاہم یہ بات مصدقہ ہے کہ یونانی زبان سے عربی میں ہونے والے تراجم معیاری تھے۔ ۸۳۲ء میں خلیفہ المامون نے بغداد میں بیت الحکمت قائم کیا اور اس کے ساتھ رصدگاہ، ایک لائبریری اور ایک دارالترجمہ بھی ملحق کر دیا جس کا

صدی قبل مسیح میں بننے والی اسکندریہ کی ایک یونیورسٹی کے بعد بغداد کا یہ بیت الحکمۃ علم و فضل کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ خلیفہ المامون کے بارے میں "الفہرست" کا مصنف اپنی ندیم لکھتا ہے۔

"مامون نے خواب میں دیکھا کہ ایک سپید رو شخص جس کی لالی جھلک رہی ہے، پیشانی کشادہ ہے، بھویں جڑی ہوئی ہیں، سر کے دونوں جانب کے بال گرے ہوئے ہیں، آنکھوں میں سرخ ڈورے ہیں اور حسنِ طبیعت کا مالک ہے، اس کے تختِ حکومت پر جلوہ افروز ہے۔ مامون کہتا ہے گویا میں اس کے سامنے کھڑا ہوں اور اس کے رعب و ہیبت تلے دبا جا رہا ہوں۔

میں نے اس سے پوچھا ـــــ "آپ کون ہیں؟"

اس نے جواب دیا ـــــ "ارسطو"

میں خوش ہوا اور عرض کیا:

"اے حکیم و دانا! میں ایک سوال پوچھ سکتا ہوں؟"

کہا: "پوچھو"

میں نے عرض کیا: "حسن کیا ہے؟"

کہا: "ہر وہ شے جسے عقل حسین قرار دے!"

عرض کیا: "پھر؟"

فرمایا ـــ "جو شروع کے نقطے سے حسین ہو!"

عرض کیا ـــــ "پھر؟"

کہا ـــــ "جسے جمہور حسین کہیں!"

میں نے عرض کیا ـــــ "پھر؟"

کہا ـــ "اس کے بعد گنجائشِ سوال باقی نہیں رہتی!"

ایک روایت یہ بھی ہے: میں نے عرض کیا ـــــ "مزید ارشاد ہو!"

کہا ـــ "جو تمہیں اس قسم کی نعمتیں کرتا ہے: اسے زرِ خالص سمجھو اور اللہ کی توحید کے ساتھ وابستہ رہو۔"

یہ خواب تلاش و اشاعتِ کتب کے اسباب میں ایک اہم بنیادی سبب بنا۔[9]

خلیفہ المامون اور شاہِ روم کے درمیان دوستانہ مراسم تھے۔ المامون نے مراسلت کے ذریعے شاہِ روم کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ قدیم علوم کے نسخوں اور نادر کتب کے ذخیروں میں سے کچھ حصہ بغداد بھیج دیا جائے۔ حجاج بن مطر، ابنِ البطریق اور بیت الحکمۃ کے دیگر افسروں پر مشتمل ایک جماعت کو روم بھیجا گیا۔ اس جماعت نے وہاں سے طب، فلکیات، فلسفہ، ہیئت اور دیگر موضوعات پر بے شمار کتابیں اکٹھی کر کے بغداد لانے کا اہتمام

کیا۔ ایک روایت کے مطابق جو کتابیں روم سے بغداد بیت الحکمۃ میں لائی گئیں وہ ہزاروں اونٹوں کا بوجھ تھیں۔ ان میں کئی کتب نہایت بوسیدہ اور کرم خوردہ ہو چکی تھیں۔ المامون نے ان کتب کے تراجم کا سلسلہ شروع کروایا۔

یحییٰ ابن ماسویہ کو بیت الحکمۃ کا صدر بنایا گیا تھا۔ اس نے خلیفہ ہارون الرشید کے لئے کئی اہم کتب کے تراجم کیے۔ حسنین بن یحییٰ کا شاگرد تھا جس نے بیت الحکمۃ میں اپنے رفقائے کار کے ساتھ افلاطون، ارسطو، اقلیدس، ارشمیدش، جالینوس وغیرہ کی کتب کے ترجمے کیے۔ نسطوری مترجموں کا صدر حسنین بن اسحٰق تھا تو صابئی مترجموں کا سربراہ ابن قرہ (۸۳۶ء) تھا۔ یہ مترجمین حران اسکول سے تعلق رکھتے تھے جو فلسفہ اور طب کی تعلیم کے لیے مشہور تھے۔ ان صابئی مترجمین نے خلیفہ معتضد کے زمانے میں ہیئت، فلسفہ اور طب و ریاضی پر یونانی تصانیف کا عربی میں ترجمہ کیا۔ دسویں صدی کے دوسرے نصف میں یعقوبی مترجمین کا ایک گروہ ابھرا جس میں یحییٰ بن عدی (المتوفی ۹۷۴ء) اور ابو عیسیٰ ابن زرعہ (۱۰۰۸ء) کے نام قابل ذکر ہیں۔ یعقوبی مترجمین نے جہاں بہت سی نئی کتب کے تراجم کیے وہاں انہوں نے گزشتہ تراجم کی صحت و درستی پر بھی خاصا کام کیا۔ قیام بغداد کے بعد نصف صدی کے اندر اندر یونانی علوم کی بے شمار کتب عربی زبان میں منتقل ہو گئیں تھیں۔ یہ وہ دور تھا جب بقول ہٹی اہل مغرب حروف تہجی لکھنا سیکھ رہے تھے۔

مسلمان مفکرین نے صرف تراجم اور یونانی فلاسفہ کے اتباع تک ہی خود کو محدود نہ رکھا۔ بعض میدانوں میں وہ قدیم یونانی فلاسفہ کو بھی مات کر گئے۔ انہوں نے خطاطی اور خوش نویسی کے فن کو عروج تک پہنچا دیا۔ ریاضیات میں ہندسوں کا استعمال بعوض جمل ابجدی۔ صفر اور عشاریہ کی ترویج انہی نے کی۔ علم ہندسہ اگرچہ یونانیوں سے انہوں نے سیکھا تاہم انہوں نے اس میں مناسب ترمیم و اضافہ کیا۔ الجبرا خالصتاً مسلمانوں کی ایجاد ہے۔

مخروطی اجسام کی پیمائش اور مسافت کا علم ایجاد کیا۔ ریاضی کی نئی علامتیں بنائیں۔ طبیعیات میں پنڈولم کا ایجاد کا اصول بصارت اور روشنی کے بارے میں قابل قدر تحقیقات کیں۔ علم ہیئت کو اتنی ترقی دی کہ ان کے ایجاد کردہ اوزار آج بھی جدید رصدگاہوں میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ علم طب کی تدوین کی اور علم جراحی کو وسعت دی۔ کلوروفارم، الکحل، پوٹاش، نائیٹریٹ آف سلور، نائیٹرک ایسڈ اور کئی قسم کی گیسیں مسلمانوں نے ایجاد کیں۔

یونانی علوم کے نسطوری مترجمین کو یونانی ڈرامے، یونانی شاعری اور یونانی آرٹ سے کوئی دلچسپی نہ تھی، چنانچہ عرب ذہن یونان کے ان اہم ثقافتی پہلوؤں سے ناآشنا رہا۔ صرف ہومر کی ایلیڈ (Illiad) کو جزوی طور پر ترجمہ کیا گیا تھا۔"فنون لطیفہ کے ضمن میں عرب ایرانیوں سے زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ ایک دوسری بات جو تعجب خیز ہے وہ یہ ہے کہ علوم و فنون کو ترقی دینے اور بہت سے نئے علوم و فنون ایجاد کرنے کے باوجود مسلمانوں میں علم السیاسہ کو ترقی دینے اور اسے بہتر بنانے کا جذبہ پیدا نہ ہوا۔ ابتدائی طرز خلافت کو وہ پچاس سال تک بھی برقرار نہ رکھ سکے۔ اسلام مزاج کے اعتبار سے جمہوریت کا حامی تھا۔ لیکن خلافت راشدہ کے بعد اس میں جبر اور ملوکیت کا

رجحان بڑھتا گیا۔ فلاسفہ اور دانشوروں نے نہ تو کوئی ایسا مخصوص نظام حکومت وضع کیا جس میں حصول اقتدار اور انتقال اقتدار کا کوئی ضابطہ مقرر کیا ہوتا اور نہ ہی انہوں نے مسلمان حکمرانوں کی سیاسی چیرہ دستیوں اور من مانیوں پر تنقید اور محاکمہ کیا یہی وجہ ہے کہ ان کی طویل تاریخ میں کہیں بھی جمہوری رجحانات فروغ نہ پا سکے۔ حاکموں کے آمرانہ اور خود پسندانہ مزاج کی وجہ سے مسلم ثقافت کو نہایت گہرے چرکے لگتے رہے۔ محلاتی سازشوں، سیاسی ریشہ دوانیوں اور غیر جمہوری اندازِ اطوار نے بغداد کے قصر خلافت کو اس حد تک کھوکھلا کر دیا تھا کہ ہلاکو خان آندھی اور طوفان کی طرح بڑھتا چلا گیا اور عروس البلاد کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ بیت الحکمۃ کو نذرِ آتش کر دیا اور کتب کے ذخیرے کو دجلہ کی لہروں میں بہا دیا۔

اس باب میں ہمارا بنیادی مقصد یہ ہے کہ یونانی فلسفے کے پھیلاؤ اور مسلم فلسفے کی تشکیل پذیری میں اس کے اثرات کا جائزہ لیا جائے لہٰذا ریاضیات، طب اور دیگر علوم[12] کو ہم نظر انداز کر کے اپنی توجہ صرف فلسفے پر مرکوز کرتے ہیں۔

ہیلانیاتی ثقافت کے اثر و نفوذ سے پہلے سامی (Semitic) ذہن فلسفیانہ تفکر اور منطقی استدلال سے ناآشنا تھا۔ ان لوگوں کی حکمت اقوالِ زریں، روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے معموں اور ان کے حل اور معاشی و سماجی معاملات میں عقل و دانش کے استعمال تک محدود تھی۔ اگر کوئی انفس و آفاق پر غور و تامل بھی کرتا تو یہ اس کی انفرادی سطح تک رہتا۔ جہاں کہیں عقل عاجز آجاتی اس معاملے کو رضائے الٰہی کی طرف منسوب کر کے لوگ مطمئن ہو جاتے تھے۔ عہد نامہ عتیق کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سامی ذہن کے نزدیک حکمت و دانش کا مفہوم یہی تھا جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔ حکمت و دانش کا یہی سطحی اور غیر تکنیکی مفہوم عربوں نے بھی اپنایا تھا چنانچہ ملکہ سبا اور لقمان حکیم کے قصوں میں اسی قسم کی حکمت و دانش کا ذکر ملتا ہے[13]۔

الجاحظ کہتا ہے کہ حکمت و دانش کا نزول تین چیزوں پر ہوا۔ ان میں ایک فرنگیوں کا سر ہے، دوسری چینیوں کے ہاتھ اور تیسری شے عربوں کی زبان ہے[14]۔ یعنی مبداء فیض سے جہاں فرنگیوں کو عقل و دانش اور فہم و فراست ملی اور چینیوں کو دست کاری اور ہنر مندی ملی وہیں عربوں کو فصاحت و بلاغت ملی۔ دیگر زبانوں کی طرح عربی زبان کی نمو پذیری بھی شاعری سے ہوئی۔ لیکن عربوں کی بالکل ابتدائی شاعری بھی اتنی بھرپور اور بیان و اظہار کے لحاظ سے اس قدر بلیغ اور فصیح ہے کہ آج کے دور کے شعراء بھی اس کے کمال کا اعتراف کرتے ہیں۔ دورِ جاہلیت میں شاعری کی روایت زبانی تھی۔ زبانی شعر کہے جاتے اور انہیں حافظے میں محفوظ رکھا جاتا تھا۔ بدوی زندگی میں لکھنے پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ شاعری کو باقاعدہ صیغۂ تحریر میں لانے کا عمل دوسری اور تیسری صدی ہجری میں شروع ہوا تھا[15]۔ دورِ جاہلیت میں شاعر ایک مخصوص حیثیت کا حامل ہوتا تھا۔ وہ نہ صرف اپنے قبیلے بلکہ دیگر قبائل کی تاریخ اور رسم و رواج سے بھی آگاہ ہوتا تھا۔ خانہ بدوشی اور سیر و سیاحت کی وجہ سے اسے اپنے علاقے کی جغرافیائی صورتِ حال کا علم ہوتا تھا اور اس کا وہ اپنے اشعار میں مناسب جگہوں پر اظہار کرتا۔ کسی شخص سے روایت ہے کہ وہ صحرا میں سفر

کرتے ہوئے راستہ کھو بیٹھا لیکن امراء القیس کا ایک شعر اسے یاد تھا جس میں کسی پرانے کنویں کا ذکر تھا؛ چنانچہ اس کنویں کی نشانی سے اس شخص کی راہنمائی ہو گئی۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دورِ جاہلیت کا شاعر صحرا کی بدویانہ زندگی میں فکری روایت کا امین ہوتا تھا۔ تمام علاقوں کے قبائل عکاظ کے سالانہ میلے پر اکٹھے ہوتے۔ یہ اجتماع اگرچہ تجارتی اور مذہبی نوعیت کا ہوتا لیکن اس میں عربوں کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا بھرپور اظہار ہوتا تھا۔ شعراء اپنا کلام سناتے اور حاضرین بڑے غور اور دلچسپی سے سنتے۔ عربی زبان مترادفات، ذخیرۂ الفاظ اور معانی کے تنوع کے اعتبار سے دنیا کی منفرد زبان ہے؛ چنانچہ اس کے بھرپور اظہار، فطری بے ساختگی اور اثر آفرینی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن ان صفات کے باوجود دورِ جاہلیت کی شاعری کا فکری افق بہت محدود تھا۔ اس کی وجہ ایک تو صحرا کی بدویانہ زندگی تھی اور دوسرے دیگر تہذیبوں اور ثقافتوں سے ان کا کوئی مستقل رابطہ نہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض عرب قبائل اردگرد کی ریاستوں مثلاً شام، یمن وغیرہ سے تجارت کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ عیسائی راہب بھی عرب علاقوں سے سفر کیا کرتے تھے۔ اسی طرح یہودیوں سے بھی ان کے روابط تھے۔ یہ مصری اور یونانی لوگوں کو بھی جانتے تھے۔ یونانی بھی ان سے واقف تھے؛ چنانچہ قدیم یونانی لٹریچر میں عربوں کا تذکرہ ملتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عربوں کے آزاد طرزِ زندگی سے بہت متاثر تھے[۲۲] لیکن یہ سارے روابط بڑے سطحی تھے۔ صحرا کی زندگی عربوں کی فطرت میں اس حد تک راسخ تھی کہ وہ کسی دوسرے طرزِ زندگی کی طرف مائل ہی نہیں ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عرب ہی وہ قوم تھے جنہوں نے اسکندریہ میں اپنا کوئی سفیر نہ بھیجا تھا[۲۳]۔ دوسرے یہ کہ عرب لوگ بالعموم ان پڑھ تھے اور پڑھنے لکھنے کا نہ ان کے اندر کوئی رجحان تھا اور نہ ہی اس کے مواقع میسر تھے۔ عرب میں فکری اور ثقافتی لحاظ سے اگر کوئی شخص اہمیت رکھتا ہے تو وہ شاعر تھا جو جغرافیہ دان، ماہر تاریخ، ماہر لسانیات، ماہر حرب و ضرب ہونے کے ساتھ ساتھ مختلف قبائل کی عقلی روایات اور طرزِ فکر کا امین ہوتا تھا۔

یہ وہ ماحول تھا جس میں نزولِ قرآن اور اسلام نے ایک آفاقی مذہب کی حیثیت سے اس سرزمین میں جڑیں پکڑنی شروع کیں۔ قرآن کی زبان اگرچہ ایک اپنی ہی مخصوص اور منفرد حیثیت رکھتی ہے تاہم اظہار کی بے ساختگی اور شدت میں یہ جاہلیت کے دور کی شاعری سے سبقت لے گئی۔ شاعری نہ ہونے کے باوجود یہ زبان شاعرانہ ہے کیونکہ قرآن اپنے فکری اور سماجی پس منظر سے علیحدہ نہیں ہو سکتا۔ ایک اور اہم پہلو جو قرآن کی زبان کو دورِ جاہلیت کی شاعری سے ممتاز و جہاں کرتا ہے یہ ہے کہ اس کا فکری افق دورِ جاہلیت کی شاعری کی طرح محدود نہیں۔ قرآن متنوع موضوعات اور متعدد مسائل سے بحث کرتا ہے۔ انسان کی داخلی زندگی کے موضوعی پہلوؤں سے لے کر کائنات کے مابعد الطبیعی اور معروضی پہلوؤں تک اس کا دائرہ بحث پھیلا ہوا ہے۔ انسان کے وجود میں آنے کی سرگزشت، قدیم اقوام کے قصے، خیر و شر کی کشمکش، موت اور موت کے بعد بعثتِ ثانیہ اور جزا و سزا کا عمل یہ وہ نمایاں موضوعات ہیں جن پر قرآن اپنے مخصوص انداز میں روشنی ڈالتا ہے۔ اس کی حیثیت محض بیانیہ ہی نہیں بلکہ اوامر و نواہی کے حوالے سے مخصوص اخلاقیات بھی دیتا ہے۔

یہاں ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ قرآن کو لوگوں کے سامنے ایک نظامِ فکر یا دبستانِ فلسفہ کی حیثیت سے

پیش نہیں کیا گیا تھا، اس کی اٹھان، اس کا مزاج اور اس کا لب و لہجہ اس دور کے تہذیبی اور ذہنی پس منظر کے عین مطابق تھا، اس کی آیات مخرب الامثال اور اساطیر الاولین کے بیان کا انداز ان لوگوں کے لئے اجنبی تھا لیکن اس کا فکری افق اس قدر وسیع تھا کہ عرب ذہن آہستہ آہستہ اس کے ساتھ مطابقت پذیر ہوا۔ سرزمین عرب پر اسلام کے مکمل تسلط کے بعد بھی کافی عرصے تک مسلمانوں کی ذہنی و فکری زندگی میں کوئی دشواری پیش نہ آئی، وہ حکمت و دانش کی باتیں تسلیم کرنے اور جہاں فکر عاجز آجاتی وہ معاملے کو رضائے الٰہی کی طرف منسوب کر دیتے یہ قدیم عربوں کی روایت تھی جو اسلام کے بعد بھی جاری رہی، اصل مسئلہ اس وقت پیدا ہوا جب یہ فاتح بن کر دوسرے ممالک میں گئے اور دیگر تہذیبوں اور ثقافتوں سے ان کا رابطہ قائم ہوا، دیگر زبانوں سے جب مختلف علوم ترجمہ ہو کر مسلمانوں تک پہنچے تو وہ اپنا قدیم طرز فکر چھوڑ کر ایک نئی ذہنی روش اپنانے پر مجبور ہو گئے، ایک طرف ان کے اسلامی افکار و عقائد تھے جنہیں وہ کسی صورت میں ترک نہیں کر سکتے، دوسری طرف یونان، روم، ہندوستان اور ایران کی طرف سے آنے والے فکری اثرات تھے جو انہیں مجبور کر رہے تھے کہ وہ اپنی عقل و حکمت کی متفرق اور غیر مربوط روایات کو ایک نظام فکر کی صورت میں مربوط و منظم کریں، یہ وہ حالات ہیں جن میں "مسلم فلسفہ" نمو پذیر ہوتا ہے۔

مسلمانوں نے جس طرح کیمیا، طب، جغرافیہ اور ریاضی وغیرہ جیسے علوم میں فکر و تحقیق کی نئی راہیں تراشیں، ویسے فلسفے میں کسی نئی روایت کا آغاز نہیں کیا، فلسفیانہ فکر[۱۵] مسلمانوں میں تین سطحوں پر صورت پذیر ہوتا ہے:

(ا)	علم الکلام	Theology
(ب)	تصوف	Sufism
(ج)	عقلیت	Rationalism

(ا) _____ مسلمانوں میں فلسفیانہ تفکر کی ابتدا الہیاتی یا کلامی بحثوں سے ہوئی، اس ضمن میں معتزلہ اور اشاعرہ کے دو مشہور مکاتب فکر وجود میں آئے۔ معتزلہ وحی اور عقل دونوں کو علم کا منبع و مصدر سمجھتے ہیں اور انہیں ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اگر وحی اور عقل میں عدم مطابقت پیدا ہو جائے تو وہ وحی کو عقل کی روشنی میں پرکھنے کے قائل ہیں، اسی طرح وہ کائنات کو قدیم نہیں بلکہ حادث تسلیم کرتے ہیں، وجود محض ایک صفت ہے جس کا ہونا یا نہ ہونا یکساں طور پر ممکن ہے، اشیا، کا مادی روپ میں آنا اور معدوم ہو جانا دراصل صفتِ وجود سے متصف ہونا یا اس سے عاری ہو جانا ہے، اللہ تعالیٰ قدیم ہے واحد ہے اور اس کی طرف انسانی صفات مثلاً رحم، ہمدردی اور عقل و قوت وغیرہ منسوب نہیں کی جا سکتیں۔ اللہ تعالیٰ کو اشیا، کا علم اپنے عین سے حاصل ہوتا ہے نہ کہ انسانوں کی طرح اپنی صفات یا احوال سے۔ وہ اس کی قدرتِ کاملہ کی حد بندی کرتے ہیں، ان کے نزدیک خدا شر کا ارادہ نہیں کر سکتا اور نہ ہی اسے تخلیق کر سکتا ہے جو کہ عقلاً محال ہو۔ معتزلہ انسان کو اس کے اعمال و افعال میں خود مختار تصور کرتے ہیں، عدل ان کے نزدیک کائنات کا اصول مطلق ہے جس کی پابندی خود خدا بھی کرتا ہے، اس طرح وہ سزا و جزا کے ایک میکانکی نظام کے قائل ہیں جس میں شفاعت اور گناہوں سے برأت کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس مکتب فکر کے نمایاں مفکرین واصل بن عطا، نظام،

جاحظ اور اخوان الصفا ہیں۔

متکلمین کا دوسرا مکتبِ فکر اشاعرہ کا ہے جس کے بانی الاشعری تھے۔ یہ مکتبِ فکر عراق میں قائم ہوا تھا۔ اس کے مقلدین کو اشاعرہ کہا جاتا ہے۔ اشاعرہ صرف وحی اور الہام کو ذریعۂ علم تسلیم کرتے ہیں اور عقل کو اس کے اثبات اور تائید کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اشاعرہ یونانی فلسفے پر اس لئے عبور حاصل کرنا چاہتے تھے کہ اس کا ردّ خود اسی سے کر سکیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات اس کی ذات میں شامل نہیں سمجھتے کیونکہ اس طرح ان کے نزدیک بالآخر صفات کا انکار لازم آتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات سادہ اور غیر مرکب نہیں رہتی۔ وہ قرآن کو اللہ تعالیٰ کا کلام سمجھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے۔ اس لئے قرآن ان کے نزدیک غیر مخلوق اور اللہ کی دیگر صفات کی طرح ازلی اور قدیم ہے۔ وہ بات کے قائل نہیں کہ جسمانی آنکھوں سے دیدارِ الٰہی ہو سکتا ہے۔ انہوں نے انسانی اختیار کی حدود کا تعین کیا اور مسئلہ جبر و قدر کو ایک نئے انداز سے حل کیا۔ اشاعرہ کے نزدیک کائنات لاتعداد غیر محسوس جواہر (Atoms) سے عبارت ہے جن میں امتداد نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر لمحے نئے جواہر تخلیق کرتا رہتا ہے جبکہ پرانے جواہر مسلسل معدوم ہوتے رہتے ہیں۔ اس مکتبِ فکر کے بڑے بڑے مفکر یہ ہیں۔ الاشعری (۲۶ - ۹۳۰ء) ابوبکر باقلانی (المتوفی ۱۰۱۳ء)، امام الحرمین (المتوفی ۱۰۸۵ء) شہرستانی (المتوفی ۱۱۵۳ء)، الرازی (المتوفی ۱۲۰۹ء) اور الغزالی (المتوفی ۱۱۱۱ء) الغزالی کی حیثیت متکلمین اور صوفیاء میں "پل" کی سی ہے۔ ان کے افکار کئی اعتبار سے اہمیت رکھتے ہیں لیکن یہاں ان کی گنجائش نہیں کہ ان پر تفصیلاً بحث کی جائے۔[۱۹]

(ب) ـــــ سریّت (Mysticism) کا کوئی مخصوص مولد و مسکن نہیں۔ یہ ایک عالمگیر رجحان ہے جو متعدد مذاہب اور اقوام میں پایا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے فلسفے کی تاریخ بھی ان کے تذکرے کے بغیر نامکمل رہتی ہے۔ تصوّف اور فلسفے میں نتائج و مقاصد کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ دونوں حقیقتِ مطلقہ تک رسائی چاہتے ہیں۔ تاہم طریق کار کے اعتبار سے دونوں میں فرق ہے۔ فلسفہ عقل کے سہارے چلتا ہے اور تصوّف میں وجدان اور عشق عرفانِ الٰہی کا واسطہ بنتے ہیں۔ مسلمان صوفیاء کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ وحدت الوجودی اور وحدت الشہودی۔ وحدت الوجودیوں کے نزدیک کائنات خدا ہے اور خدا کائنات۔ وحدت الشہود کے قائل خدا کو کائنات کے اندر اور اس سے ماورا بھی سمجھتے ہیں لیکن تمام صوفیاء اس بات پر متفق ہیں کہ حقیقتِ مطلقہ فی نفسہٖ غیر تغیر پذیر، غیر تقسیم پذیر، واحد اور ماوراے ادراک ہے۔ اس حقیقتِ مطلقہ کا اظہار جب صفاتی سطح پر ہوتا ہے یعنی جب یہ زمانی و مکانی تعیّنات میں جلوہ گر ہوتی ہے تو کائنات بن جاتی ہے۔ توبہ، ورع، توکّل، ذکر، فنا فی الشیخ اور فنا فی اللہ جادۂ طریقت کے مختلف مقامات ہیں۔ چند مشہور صوفیا کے نام یہ ہیں: حضرت علیؓ (المتوفی ۶۶۱ء)، معروف کرخیؒ (المتوفی ۸۱۵ء) رابعہ بصریؒ (المتوفی ۷۱۷ء - ۸۰۱ء) بایزید بسطامیؒ (المتوفی ۸۷۴ء) منصور حلاجؒ (المقتول ۹۲۲ء) عبدالقادر جیلانیؒ (المتوفی ۱۱۶۶ء) ابن العربی (المتوفی ۱۲۴۰ء) علی ہجویریؒ (المتوفی ۱۰۷۲ء) معین الدین چشتیؒ (المتوفی ۱۲۳۶ء) نظام الدین اولیاؒ (المتوفی ۱۳۲۵ء) احمد سرہندیؒ (المتوفی ۱۶۲۴ء) اسلامی تصوّف پر اگرچہ بدھ مت، عیسائیت، ایرانی فلسفے کے اثرات ہیں، تاہم فلسفۂ یونان، بالخصوص نو افلاطونیت کے اثرات زیادہ ہیں۔

(ج) ـــــــ مسلمان مفکرین کا تیسرا گروہ عقلیت پسندوں کا ہے۔ انہیں ہم بجا طور پر فلاسفہ کا نام دے سکتے ہیں۔ عقلیت پسندوں کے نزدیک وحی اور عقل دونوں ہی علم کے سرچشمے ہیں لہٰذا فلسفے اور مذہب کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش ان کا مابہ الامتیاز ہے۔ ان فلسفیوں نے یونان کے علوم پر مکمل عبور حاصل کیا یہ لوگ فلسفی ہونے کے علاوہ سائنسدان بھی تھے۔ علم کیمیا، ریاضی، فلکیات اور دیگر علوم پر بھی انہیں مکمل عبور حاصل تھا بلکہ بالمقابل فلسفہ ان علوم میں انہوں نے جدت و ندرت فکر کا مؤثر ترین مظاہرہ کیا۔ مسلمان فلسفیوں میں چند مشہور نام یہ ہیں

الکندی (المتوفی ۸۷۳ء) فارابی (المتوفی ۹۵۰ء) ابن مسکویہ (المتوفی ۱۰۳۰ء) ابن سینا (المتوفی ۱۰۳۷ء) ابن رشد المتوفی ۱۱۹۸ء) ابن الہیثم ۱۰۳۹ء) ابن ماجہ (المتوفی ۱۱۳۸ء) ابن طفیل (المتوفی ۱۱۸۵ء) الکندی فارابی اور ابن سینا نے مسلم عقائد کو افلاطون اور ارسطو کے افکار سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا۔ فارابی ارسطو کے فلسفے سے زیادہ متاثر نظر آتا ہے جبکہ ابن سینا کا جھکاؤ نوافلاطونیت کی طرف تھا۔ ان فلسفیوں نے تباہ شدہ یونانی ثقافت کے ملبے سے فلسفہ یونان کے تن مردہ کو نکالا اور اس میں نئی روح پھونک دی۔ اہل مغرب تک فلسفہ یونان انہی فلاسفہ کے توسط سے پہنچا۔ ان میں اگرچہ بعض مقامات پر جدت فکر کے آثار ملتے ہیں، تاہم مسلم فلسفہ بنیادی طور پر فلسفہ یونان کو اسلامی عقائد سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش ہے۔ افلاطون، ارسطو اور فلاطینوس وغیرہ کو وہ سند تسلیم کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے مسلم فلسفہ معذرت خواہانہ بن جاتا ہے۔ مسلم فلسفے کا یہ کردار دور جدید میں بھی ایسا ہی ہے۔

سائنس کے نظریات سے مذہبی عقائد کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کوشش میں بعض اوقات مذہبی عقائد کی ایک ایسی عجیب و غریب تشریح کی جاتی ہے کہ عقل پریشان ہو جاتی ہے۔ اس کوشش کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ مذہب کو سائنس کے ساتھ مستقلاً ہم آہنگ نہیں کیا جا سکتا۔ سائنسی نظریات تبدیل ہوتے رہتے ہیں چنانچہ مذہبی عقائد کو ہر دور میں ان سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ کسی مفکر نے یہ کوشش نہیں کی کہ کوئی ایسا فلسفہ پیش کیا جائے جس کا تار و پود خالصتاً اسلامی افکار سے تیار ہوتا ہے۔ چین کا فلسفہ یا ہندوؤں کا فلسفہ خود ان کا اپنا فلسفہ ہے، وہ دیگر فلسفوں سے اس کا تقابل تو ضرور کرتے ہیں تاہم انہیں اپنے فکر کی بنیاد نہیں بناتے۔ اسی طرح مسلمان مفکرین کو چاہیے تھا کہ کسی دوسرے فلسفے سے متاثر ہوئے بغیر قرآن کی اپنی مابعد الطبیعات، اخلاقیات، سیاسیات، طریق استدلال اور نظریہ علم کے خدوخال اجاگر کرنے کی کوشش کرتے۔

حواشی :

۱۔ تاریخ اقوام عالم از مرتضیٰ خان ۲۲۵

۲۔ ڈی اولیری " یونانی علم عربوں تک کیسے پہنچا ؟" لندن ۱۹۶۴ء ص ۱۹۔

۳۔ ہیلنی Helenic اور ہیلانیاتی Hellenistic میں فرق ملحوظ رکھنا چاہئے ہیلنی کا حوالہ صرف یونان کی طرف ہے جبکہ ہیلانی کا حوالہ یونان کے زیر اثر پیدا ہونے والی وسیع تر ثقافت کی طرف ہے۔

۴۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں مسلمان فوجوں نے مصر پر چڑھائی کی ۔ ۶۴۲ء میں چھاؤنی کے محاصرہ کے بعد یہ شہر فتح کر لیا گیا۔ عیسائی مؤرخین عموماً یہ الزام لگاتے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے حملے کے دوران علم و ادب کے اس مرکز کو تباہ کر دیا تھا مگر یہ بات صحیح نہیں ۔ عربوں کے حملے سے بہت پہلے جولیس سیزر Julius Caesar نے ۴۸ ۔ ق م میں اسکندریہ کی لائبریری کو نذر آتش کر دیا تھا۔ اس کے بعد ۳۸۹ء میں تھیوڈوسس Theodosius کے حکم سے اسے مکمل طور پر تباہ و برباد کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ عربوں کے حملے کے وقت وہاں سرے سے کوئی لائبریری موجود ہی نہ تھی ۔ ملاحظہ کیجئے پروفیسر ہٹی کی "عربوں کی تاریخ"۔ (انگریزی) ص ۱۶۶

۵۔ قدیم یونانی ثقافت کی ڈکشنری (انگریزی) لندن ۱۹۶۱ء ص ۳۰

۶۔ میوزز Muses قدیم یونانی دیومالا میں وہ دیویاں تھیں جنہوں نے جنات Giants پر دیوتاؤں کی فتح کا ترانہ گایا تھا۔ میوزز کو دیوتا زیوس Zeus کی بیٹیاں سمجھا جاتا تھا۔ بطلیموس کے عجائب گھر کی نادر اشیا اتنی سے منسوب تھیں اسی لیے لفظ میوزیم Museum رائج ہو گیا۔

۷۔ تاریخ اقوام عالم از مرتضیٰ احمد خان ۔ مجلس ترقی ادب لاہور ۔ ص ۲۷۲

۸۔ مسلمانوں کے افکار از پروفیسر ایم ایم شریف ۔ ص ۱۶

۹۔ ایرانی سلطنت میں نصیبین کے مقام پر ان نسطوری عیسائیوں نے ایک مدرسہ قائم کیا جنہیں انطاکیہ

اور یونانی بولنے والے شامی علاقوں سے نکال دیا گیا تھا۔ چھٹی صدی کے وسط میں اداہبا نے جو کہ ایک زرتشتی نماعیسائی تھا، سلوقیہ نے مقام پر نصیبین کے طرز کے ایک مدرسے کی بنیاد رکھی اس کے کچھ عرصہ بعد جندی شاپور میں شاہ ایران نوشیرواں نے ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی۔ اس مدرسہ میں ان سات فلسفیوں کو متعین کیا گیا جو بازنطینی شہنشاہ جسٹینین کے حکم سے ایتھنز کا سکول بند ہو جانے کے بعد بھاگ کر ایران چلے آئے تھے۔ ان سب مدارس میں فلسفۂ یونان کی تعلیم دی جاتی تھی۔

۱۰۔ ابن ندیم: "الفہرست"۔ مقالۂ ہفتم۔ ص ۵۶۹ - ۵۷۰
ترجمہ: مولانا اسحٰق بھٹی۔ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور

۱۱۔ مختلف زبانوں سے عربی میں ترجمہ ہونے والی کتب اور ان کے مترجمین کے اسماء جاننے کے لئے ملاحظہ کیجئے:

۱۔ پروفیسر ہٹی: عربوں کی تاریخ (انگریزی) باب ۲۴۔ ص ۳۱۱ Translation
۲۔ ابن ندیم: الفہرست۔ ترجمہ، مولانا اسحٰق بھٹی، باب ہفتم
۳۔ اولیری: یونانی علم عربوں تک کیسے پہنچا۔ باب پنجم The Nestorians

۱۲۔ پروفیسر ہٹی: عربوں کی تاریخ (انگریزی) باب ۲۴ ص ۳۱۱

۱۳۔ ان علوم کی تدوین کا جائزہ لینے کے لئے دیکھئے "مسلمانوں کے افکار" از ایم ایم شریف۔ باب ۳

۱۴۔ ڈی بوئر ــــــ ہسٹری آف فلاسفی ان اسلام (انگریزی) لندن ۱۹۰۳ء ص ۶-۷

۱۵۔ پروفیسر ہٹی: عربوں کی تاریخ (انگریزی) ص ۹۲

۱۶۔ " " " " "

۱۷۔ " " " " ۴۴

۱۸۔ " " " " ۴۶

۱۹۔ یہاں اتنی گنجائش نہیں کہ مسلم فلسفے پر تفصیلاً بحث کی جائے۔ اس مقصد کے لئے دیکھیے:
"مسلم فلسفہ" (انگریزی) ۲ جلدیں۔ مؤلفہ پروفیسر ایم ایم شریف اور
"مسلم فلسفہ" ڈاکٹر عبدالخالق اور پروفیسر یوسف شیدائی۔

۲۰۔ اس مقصد کے لئے ملاحظہ کیجئے: "مسلمانوں کے افکار" از پروفیسر ایم ایم شریف۔ ص ۹۴

تبصرۂ کتب

دِل و نظر کا سفینہ سنبھال کر لے جا
مہ و ستارہ ہیں بحرِ وجود میں گرداب